تحریک اسلامی کی نصف صدی سے آخری ملاقات

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

کم آمیزی اور ''شوبازی'' سے گریز دو ایسے عناصر ہیں جو میرے عملی کردار میں پوری طرح بلکہ بری طرح رچے بسے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ بزرگوں کے حضور حاضری اور ''بڑوں'' کے چرنوں میں سیس نوائی سے ''فیضیابی'' میرے حصے میں کم کم ہی آئی ہے۔ ''فیضیابی سے محرومی'' کا تو احساس ہی نہیں البتہ بزرگوں کے حضور حاضری سے محرومی جہاں میرے لیے بڑے خسارے کا باعث ہے وہاں شدید حسرت، قلق اور ندامت کا سامان بھی ہے! بات یہ ہے کہ بڑوں کے تو ''شاہانہ وحاکمانہ'' تکبر وغرور سے نفرت ہے بلکہ گھن آتی ہے لیکن بزرگان فضل وکمال کی ہیبت اور وضع داری حائل رہی ہے! اس کم آمیزی اور شوبازی سے گریز کو ''دو مزید عناصر ترکیبی'' نے چار چاند لگا دیے ہیں اور وہ ہیں لکیر کی فقیری اور کام سے کام رکھنے کی ''عادتِ بد''! حضرت مولانا نعیم صدیقی، رحمہ اللہ، سے قربت اور ملاقات میں بھی یہ ''عناصرِ اربعہ'' کچھ کچھ حائل ہوتے رہے ہیں!! ویسے راز کی بات یہ ہے کہ ''اپنی فطرت کے یہ عناصر اربعہ'' قدرے مفید بھی رہے ہیں ایک تو اس سے وقت کی مقدار وافر بچتی رہی ہے اور دوسرے اپنی خوبیاں (جو بہت کم بلکہ معدوم کے زمرے میں آتی ہیں) اور خامیاں (جو بکثرت ہیں) ان بزرگوں اور بڑوں سے پوشیدہ ہی رہی ہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ خسارہ کوئی اتنا ناقابل برداشت بھی نہیں ہے!، جس انسان کی برائیاں اور خامیاں خلق خدا سے پوشیدہ رہ جائیں اور صرف اس ذات پاک ہی کو حساب دینا پڑے جو علام الغیوب بھی ہے اور ''علام العیوب'' بھی، تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے!

لیکن مولانا نعیم صدیقی سے نصف صدی سے زائد کی جو شناسائی تھی اس میں نہ تو کبھی کم آمیزی حائل ہو سکی اور نہ لکیر کی فقیری نے کبھی دامن کھینچنے کی جرئت کی، کئی بار ان کو قریب سے دیکھا، متعدد بار ان سے گفتگو ہوئی اور بار بار ان سے رجوع کرنے کی نوبت آئی! بلکہ خوشاب راولپنڈی کی دور افتادہ بستیوں سے انہیں اور مولانا ملک نصر اللہ خان عزیز کی خدمت میں ''عرض نامے'' بھی لکھے اور ان میں سے بعض کے جواب نامے بھی وصول کیے۔ اس طرح گویا مولانا نعیم صدیقی سے بزبان قلم اور بزبان خود تخاطب کا شرف رہا! ملک

صاحب کے خطوط تو میں نے خود غصے میں آ کر پھاڑ دیے تھے کیونکہ انہوں نے شاعری میں میرا استاد بننا نہ صرف یہ کہ قبول نہ فرمایا بلکہ سخت الفاظ میں سرزنش بھی فرمائی کہ یہ تجھے اچھے خاصے مضامین لکھتے لکھتے کیا ہو گیا ہے کہ شیطانی چرخے پر سوار ہونے کی سوجھی ہے! تجھ کو یہ نہیں معلوم کہ ملت کے بڑے بڑے کام کرنے والے سب لوگ نثر نگار ہی تھے تم بھی کچھ نہ کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لیے اس تک بندی (میں نے ایک غزل اصلاح کے لیے انہیں بھیجی تھی!!) پر لعنت بھیجو اور قلم تھام لو، کوثر اور پھر ایشیا کے لیے جو لکھتے رہے ہو اسے جاری رکھو! میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم علامہ محمد اقبال بننے سے رہے! مولانا عزیز مرحوم کے یہ الفاظ مجھے اس وقت بری طرح چبھے تھے اس لیے حافظہ سے چپ کر رہ گئے ہیں مگر آج مجھے خیال آتا ہے کہ انہوں نے مجھے صحیح مشورہ دیا تھا ان کا یہ تیر دل کے نشانے پر ایسے ہی لگا جیسے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبہ عربی میں جدید عربی کا لیکچرار بننے کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ کے ایک صائب مشورے نے مجھے ''انگریزی نویسی'' کی دلدل میں پھنسے رہنے سے بچایا تھا اور عربی میں لکھنے بولنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے کا حکم دیا تھا! اس سے بھی مجھے بے پناہ فائدہ ہوا، انگریزی تو بھول گئی مگر عربی کچھ نہ کچھ آ ہی گئی!!

تاہم اس وقت افسوس یہ ہو رہا ہے کہ نعیم صدیقی صاحب کے خطوط بھی زمانے کے چور کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے ورنہ آج وہ بہت کام آتے، فائل میں صرف ملک غلام علی صاحب کے ایک دو خط محفوظ رہ گئے ہیں (ملک صاحب میرے ہمقریہ (یہ اصطلاح قبول فرما لیجیے!) بھی تھے اور میری قوم کے سپوت بھی! ان سے خط و کتابت بھی رہی اور ملاقاتیں بھی (ان سے آخری ملاقات افغان جہاد میں شہید ہونے والے ان کے لخت جگر کی فاتحہ خوانی کے موقع پر ہوئی تھی، مجھے یہ جان کر اور سن کر بڑی خوشگوار حیرت ہوئی تھی کہ وہ شہید کا والد ہونے پر فخر کر رہے تھے اور خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے! اللہ تعالیٰ کے کیسے پر اسرار بندے تھے یہ لوگ!! اس وقت وہ وفاقی شرعی عدالت کے عہدۂ قضا سے فارغ ہو کر آ چکے تھے اور میرے ایک استفسار پر فرمانے لگے کہ ''میاں! میں تو جماعت اسلامی کی غیر منقول جائیداد ہوں!)۔

نعیم صدیقی سے پہلی ملاقات (صرف مصافحہ کی حد تک!!) سرگودہا میں ہوئی مولانا مودودی غالبا اٹھارہ ماہ کی نظر بندی کے بعد رہا ہو کر واپس آئے اور جماعتی دورے، سیاسی روابط اور پبلک جلسوں سے خطاب کے لیے پنجاب کے دورے پر تھے سرگودہا میں جماعت اسلامی کے ایک دار المطالعہ کے انچارج ملک عبدالقادر سے گہری شناسائی تھی، میں اس وقت حفظ قرآن ختم کرنے کے بعد آگئے بڑھنے کے لیے پر تول رہا تھا اور اپنے

بڑے بھائی کے ساتھ رہتا تھا، میں نے ملک صاحب سے درخواست کی کہ مجھے بھی جماعت کے بزرگوں کی زیارت سے سرفراز ہونے کا موقع فراہم کیا جائے، سرگودھا شہر کے غالبا بلاک نمبر ۱۴ یا ۱۵ میں جماعت کے کسی بزرگ کے ہاں مہمانوں کا قیام تھا، وہاں پر مولانا مودودی اور صدیقی صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوا، مولانا تو اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے اس لیے مصافحہ کے بعد بات کی جرئت نہ ہوئی مگر صدیقی صاحب سے بات چیت ہوئی اور میں نے انہیں بتایا کہ آپ کے مضامین، نظمیں اور غزلیں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے، فرمانے لگے: آپ کو کیسی لگتی ہیں؟ ظاہر ہے جواب یہی تھا کہ بہت اچھی لگتی ہیں، کاندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے فرمایا کہ جاری رکھیئے اور دوستوں کو بھی پڑھنے کی دعوت دیتے رہیئے۔ خصوصا جماعت کے لٹریچر کی اشاعت و تبلیغ میں حصہ لیجئے۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے!

اس سرسری سی ملاقات اور گفتگو کے نتیجے میں صدیقی صاحب کی تحریروں کو ہمیشہ شوق سے دیکھا اور پڑھا، روز نامہ تسنیم، سہ روزہ کوثر، ہفتہ وار ایشیا کے علاوہ چراغ راہ کراچی اور سیارہ لاہور بھی بے قاعدگی سے پڑھنے کا موقع ملتا رہا، نعیم صدیقی صاحب کی نظم، غزل اور مضمون پر پہلی نظر پڑتی اور اکثر ختم کر کے چھوڑتا تھا، جماعت نے غالبا روز نامہ ''قاصد'' کے نام سے لاہور سے ایک اخبار جاری کیا تو اس میں بھی صدیقی صاحب کی نگارشات سرفہرست اور میرے لیے کشش کا باعث ہوتی تھیں، یہ وہ زمانہ تھا کہ مصر، شام اور عراق میں انقلاب پر انقلاب آ رہے تھے تختہ الٹنا تو ایک کھیل تماشہ بن گیا تھا، شاہ فاروق کی معزولی کے بعد جنرل نجیب اور کرنل جمال عبدالناصر میں رسا کشی شروع ہوگئی تھی، پھر ناصر اور اخوان کے درمیان تصادم شروع ہوا جس کے نتائج بڑے بھیانک اور المناک نکلے، اسکندریہ میں ایک جلسہ عام میں ناصر پر قاتلانہ حملے کا ڈراما کرایا گیا جس کا الزام اخوان کے سر تھوپ دیا گیا، پکڑ دھکڑ اور پھر قید و بند کے ساتھ پھانسیوں کا سلسلہ شروع ہوا، اسلام کے بعض فوجداری قوانین پر ایک شاندار تحقیق اور عظیم الشان کتاب کے مصنف جسٹس عبدالقادر عودہ جیسے فاضل لوگوں کو ناصر کے ہاتھوں عیش پرست کمیونسٹوں نے سولی پر چڑھوا دیا، اس زمانے میں چونکہ میں عربی سیکھنے کے سلسلے میں مصر کے عربی رسائل اور اخبارات شوق سے پڑھتا تھا اس لیے مصر میں دائیں اور بائیں بازو کے لوگوں کی چپقلش کی کہانی اصل ذرائع و مصادر سے پڑھنے کا موقع ملتا تھا، اخوان (الاخوان المسلمون) اور جماعت کے لوگ قدرتی طور پر ایک دوسرے کو ''اپنا'' تصور کرتے تھے اور گہرے تعلقات کی صورتیں بھی پیدا ہوتی تھیں، اخوان پر ناصری عہد میں جو مظالم ڈھائے گئے جماعت کے اخبارات و رسائل میں ان کا خصوصی

چرچا رہتا تھا، غالباً روزنامہ قاصد ہی کا خصوصی شمارہ اخوان نمبر نکالا گیا تھا اس نمبر کے لیے بھی صدیقی صاحب کی نگارشات کو نمایاں حیثیت حاصل تھی، اس خون ریز المیہ پر ان کی ایک بڑی زوردار اور پر جوش نظم تھی جس کا علمی حلقوں میں کافی دنوں تک چرچا رہا، اس کا ایک بند اکثر دماغ کے کونے سے سر اٹھاتا اور جھانکتا رہتا ہے:

فرعون کی اے مشہور زمیں
افسوس تجھے احساس نہیں
کس خون کا تجھ کو داغ لگا!!

لاہور میں پہلے پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم اور پھر استاد کی حیثیت سے یہاں کی علمی اور ادبی شخصیات کو دور ہی سے دیکھنے اور کبھی کبھار ملنے کا شوق جہاں دیگر مراکز میں لے جاتا رہا وہاں جماعت کے مرکز اچھرہ اور پھر آج کل منصورہ میں جانے کا بھی اتفاق ہوتا تھا، صدیقی صاحب سے بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی مگر دعا وسلام پر ہی اکتفا ہوتا رہا، اچھرہ میں بارہا مولانا کی اقتدا میں نماز پڑھتے ہوئے ان کے پہلو میں کھڑا ہونے کا موقع ملتا رہا۔ ہمیشہ خوشی اور پیار سے ملتے تھے مگر میرا چونکہ مرکز نگاہ اب انگریزی یا اردو کے بجائے عربی زبان تھی اس لیے میرا زیادہ ترمیل میلاپ دار العروبہ والوں سے رہتا تھا مگر مرکز نگاہ ہمیشہ صدیقی صاحب کی ذات رہی۔

ندوی اہل علم میں سے مولانا مسعود عالم ندوی جماعت سے وابستہ تھے اور مولانا مودودی کے عقیدتمند تھے۔ جماعت نے انہیں راولپنڈی میں ایک ادارہ قائم کر کے دیا تھا دار العروبہ جہاں عربی دنیا کے اخبارات ورسائل پڑھنے کو ملتے تھے اور عربی میں اور عربی سے ترجمے کا کام بھی ہوتا تھا ندوی صاحب کی وفات کے بعد یہ ادارہ لاہور میں منتقل ہو گیا تھا اور کسی نہ کسی شکل میں آج تک چلا آتا ہے!

میں نے جب اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ عربی زبان میں مکمل کر لیا تو ٹائپ کرنے کی ضرورت پیش آئی، اردو ٹائپ رائٹر صحیح کام نہیں دے سکتا، لاہور میں صرف ایک عربی ٹائپ رائٹر تھا اور وہ جماعت کے اس ادارے کے پاس تھا، مگر پتہ چلا کہ جماعت کی سرکاری اجازت کے بغیر اس پر کوئی ذاتی چیز ٹائپ کرنے کی اجازت نہیں، میں نے اس کے لیے مولانا صدیقی سے بھی عرض کیا اور مولانا مودودی علیہ الرحمہ کے استاذ عربیہ مولانا عبید الحق ندوی مالک مکتبہ علمیہ لاہور سے مولانا کے پاس بھی سفارش کروائی مگر بے نتیجہ کوشش کا پیغام صدیقی صاحب کی زبانی نفی میں ملا، اپنے ایک ثقہ آدمی سے تفصیل جاننا چاہی تو معلوم ہوا کہ مجلس شوریٰ میں آپ کی

درخواست پر غور ہوا، پوچھا گیا کہ اس کا جماعت سے کوئی تعلق ہے؟ یا اس سے کوئی فائدہ ہوگا؟ اس کا جواب قطعی نفی میں تھا اس لیے درخواست مسترد ہوگئی، دلچسپ بات یہ ہے کہ ادارہ کے ٹائپسٹ اور روح رواں سید فیض الرحمان ہمدانی مرحوم کو عربی ٹائپ سیکھنے کے لیے مصریوں کے کلچرل سنٹر سے اجازت بھی میں نے ہی دلوائی تھی اور وہ مجھ سے عربی زبان بھی گھر آ کر سیکھتے تھے، اس واقعہ بلکہ حادثہ کے بعد صدیقی صاحب سے ملاقات کا موقع کم ہی ملا، بالآخر ایک دن خبر آئی کہ وہ جماعت سے الگ ہوگئے ہیں اور ”تحریک اسلامی“ کے نام سے نئی جماعت کے بانی بن گئے ہیں، ایک آدھ ملاقات میں سبب پوچھنے کی جسارت کی گئی مگر انہوں نے ہر بار ہنس کر ٹال دیا!

عالمی رابطہ ادب اسلامی، جس کے بانی اور تاحیات صدر مولانا ابوالحسن علی ندوی تھے، سے بھی مولانا نعیم صدیقی وابستہ رہے، یہ اسلامی ادب سے دلچسپی رکھنے والے مسلم ادباء اور شعراء کی عالمی تنظیم ہے تقریبا بیس کے قریب اسلامی ملکوں میں اس کے ارکان اور علاقائی دفاتر کام کرتے ہیں، شام کے ایک ادیب اور شاعر ڈاکٹر خالد حسن ہنداوی نے مجھے بھی اس تنظیم کی رکنیت کی ترغیب دلائی مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک دن اس کی پاکستانی شاخ کی صدارت کا بوجھ مجھے اٹھانا پڑے گا۔ ۱۹۹۳ء میں مولانا ابوالحسن ندوی نے مجھے پاکستان شاخ کا صدر نامزد کیا اور ارکان کی فہرست بھی بھجوائی تو پتہ چلا کہ صدیقی صاحب رابطہ کے اولین ارکان میں سے ہیں۔

ہم نے مولانا نعیم صدیقی کے فن اور شخصیت کے حوالے سے مقالات کا ایک مجموعہ تیار کرنے اور ان کے ساتھ ایک نشست (شام نہیں!؟) منانے کا فیصلہ کیا مگر افغانستان کے باعث ملکی حالات چونکہ ابتری کا شکار رہے اور کام میں رکاوٹیں بھی پیدا ہوتی رہیں اس لیے یہ مجموعہ پیش ہونے میں تاخیر ہوئی، میں نے جب حضرت مولانا نعیم صدیقی صاحب کو رابطے کے اس فیصلہ سے آگاہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے تھے اور فرمایا تھا کہ آپ کا رابطہ تو ہے مگر کچھ زیادہ مربوط نہیں دکھائی دیتا! دراصل یہ ایک ایسے ادیب، شاعر اور مصنف کا گلہ تھا جو ایک سیاسی تحریک سے وابستگی اور اپنی تخلیقی عطا یعنی ادبی کارناموں کے باعث ایک وسیع حلقہ شناساں ومحباں رکھتا تھا مگر انہیں فراموش کر دیا گیا حتی کہ وہ گوشہ نشینی اور بے اعتنائی سے بظاہر تنگ محسوس ہو رہے تھے، بے قدری اور ابنائے زمانہ کے ہاتھوں گوشۂ گمنامی کی قید کا اہل علم و ہنر کو ہمیشہ گلہ رہا ہے، تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ بڑے بڑے اہل علم وفن آخری ایام میں ایسے فراموش ہوئے کہ زمانہ اور اہل زمانہ کی بے اعتنائی کا گلہ اور

شکایت کرنے پر مجبور ہوتے رہے! نعیم صاحب صبر و ہمت کا پہاڑ تھے مگر بے اعتنائی کا گلہ انداز گفتگو سے بھی عیاں ہو جاتا ہے، ہوسکتا ہے یہ میرا ذاتی احساس ہو مگر آخری ایام کی بے اعتنائی احباب، گوشہ گمنامی کی زندگی اور بڑھاپے کے بوجھ کے وہ ستائے ہوئے لگتے تھے! خوددار لوگ زبان کھولنے یا الفاظ میں گلہ کرنے میں بھی اپنی سبکی محسوس کرتے ہیں، اس کی تائید میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ بھی ہے!

رابطہ کے اس فیصلے کے بعد تحریک اسلامی اور خود رابطہ ادب اسلامی کے ایسے احباب سے میں نے بار ہا درخواست کی کہ صدیقی صاحب کے فن کے حوالے سے اپنی نگارشات عطا فرمایے تا کہ اس مجموعے میں شامل ہوسکیں۔ ان میں سے اپنی وابستگی، ان کی شخصیت یا فن پر کچھ لکھیے ان میں صدیقی صاحب کے قریبی احباب اور رشتہ دار بھی تھے مگر زمانے کی مکروہات و مصروفیات کے باعث بڑی مشکلات پیش آئیں۔ ایک ایک ساتھی اور دوست کو چھ چھ سات سات بار یاد دلانے کے باوجود تعاون میں تاخیر ہوئی! دراصل مادیت کی دوڑ نے انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑا! سود خوروں نے سرمایہ پرستی کو ایسا رواج دیا ہے کہ اچھے اچھے دلدل میں پھنستے اور پھسلتے نظر آتے ہیں! لاہور کے ایک بزرگ دوست نے یہ پابندی لگا دی تھی کہ صدیقی صاحب سے اگلی ملاقات میں وہ بھی میرے ساتھ ہوں گے، اکیلے آپ نہیں ملیں گے۔ ہر دفعہ ''اگلا اتوار'' کہہ کر تاخیر کا ڈھیر لگاتے گئے مگر زندگی میں صدیقی صاحب کی زیارت سے محروم رہ گئے، اگر میں ان کی پابندی نہ توڑتا تو ان سے میری یہ آخری ملاقات محض حسرت بن کر رہ جاتی! یہ تو پابندی توڑنے اور بغاوت کرنے کا نتیجہ تھا کہ وفات سے دو تین ہفتے پہلے ان سے علیحدگی میں بڑی مفصل ملاقات کا موقع مل گیا! اس ملاقات میں عظیم صحافی جناب عرفان صدیقی صاحب نے بھی میرے ہمراہ ہونا تھا اور مولانا کے حوالے سے اپنی تحریر بھی عطا فرمانا تھی مگر نعیم صاحب کے پاس حاضری کے بعد پتہ چلا کہ عرفان صاحب تو لاہور آ کر ملے بغیر اسلام آباد واپس جانے پر مجبور ہو گئے ہیں! انہوں نے اپنے موبائل فون سے نعیم صدیقی صاحب کے فون پر بتایا کہ اس وقت وہ لاہور سے اسلام آباد جاتے ہوئے بہت سا فاصلہ طے کر چکے ہیں! یہ ایک مثال ہے مکروہات زمانہ کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مجبور انسان کی! ورنہ چشمۂ آب حیات کے قریب آ کر لب خشک لیے خوشی سے کون لوٹ سکتا ہے!؟

میری معذرت آمیز التجا اور انکار کے باوجود صدیقی صاحب نے بہ اصرار شربت روح افزا سے تواضع فرمائی! وضعدار لوگوں کا یہی کمال ہے کہ وہ اپنے مہمان کو یونہی لوٹانا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں، میں نے زور دیکر عرض کیا کہ شربت کے بجائے آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں اور میری اولین ترجیح بلکہ

تڑپتی ہوئی آرزو ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ سے پوچھوں اور سنوں! مگر ان کے فیصلہ کن لہجے کی قطعیت نے مجھے خاموش کر دیا اور ان کے اصرار کے سامنے میرا انکار بیکار ثابت ہوا!

جس مکان میں ان سے آخری ملاقات کا شرف حاصل ہوا وہ ہمارے ہاں کے عام بلکہ غریب آدمی کا مکان ہے! جس کمرے میں وہ تشریف فرما تھے اس میں کوئی صوفہ یا پر تکلف فرنیچر کا کوئی نام و نشان بھی نہ تھا، ایک پرانی سے میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں، کمرہ بھی بہت چھوٹا سا تھا جو اپنے مالک کی فقیرانہ زندگی اور اپنی بوسیدگی پر گواہی دے رہا تھا! وہ جس چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے وہ چارپائی کم اور ایک لکڑی کا پھٹا زیادہ معلوم ہوتا تھا، کوئی بستر نہ تھا ایک کھیس بچھا ہوا تھا جس پر نعیم صدیقی آرام فرما رہے تھے!

چونکہ میری اور عرفان صدیقی صاحب کی آمد سے وہ آگاہ تھے اس لیے تیار تو نہیں کہہ سکتے البتہ آمادۂ ملاقات ضرور تھے! میں جب اندر داخل ہوا تو وہ چارپائی پر بیٹھے تھے تکیئے سے ٹیک لگا رکھی تھی، بڑے تپاک سے خوش آمدید کہا اور مصافحہ کیا اس وقت تک انہیں عرفان صاحب کی لاہور آمد کا علم ہو چکا تھا مگر شومئ قسمت سے انہیں کسی مجبوری کے باعث اچانک اور فوراً واپس جانا پڑا! نعیم صاحب نے تو افسوس کا اظہار نہیں فرمایا تھا مگر مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا مگر کیا کریں مکروہات زمانہ کے جبر کے سامنے شکریہ کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا!

صدیقی صاحب کو منصورہ ہسپتال سے واپس آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا بیماری کی نقاہت کے باوجود وہ ہشاش باش نظر آئے دراصل جیسے جیسے اللہ تعالیٰ سے قربت کے لیے فاصلے سمٹتے جاتے ہیں ویسے ہی نیک روحیں خوشیاں مناتی ہیں۔ اس لیے قرب اجل کے وقت لبوں کا تبسم مرد مومن کی نشانی والی بات محض شاعرانہ بات نہیں بلکہ ایک حقیقت ثابتہ ہے، انہیں ہشاش بشاش دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ وہ رابطہ کے پروگرام میں شرکت پر بخوشی آمادہ ہیں لیکن مرد مومن کا تبسم تو اپنے رب کے حضور حاضری کی قربت کا مژدہ تھا!

ایک گھنٹہ سے زاید ان کے پاس گذارا اس دوران میں ماضی کے علاوہ حاضر کی باتیں بھی ہوئیں اور ان کی ادبی زندگی بھی موضوع گفتگو رہی! میں انہیں ہمیشہ یو پی سی پی کا بھائی تصور کرتا رہا مگر اس دن پہلی بار مجھے علم ہوا کہ وہ تو ٹھیٹھ پنجابی ہیں مگر اردو ٹھیٹھ ہی بولتے ہیں! عطاء صاحب اور ایک خاتون کی تحریر بعد میں پڑھنے کو ملی تو بات مزید کھلی! ہمارے پنجاب کے ایسے دیوانے بھی ہیں جو حب اردو میں اہل اردو سے بھی آگے گئے ہیں! اگر کوئی چاہے تو نسبت لاہور کے اصل لاہوریئے ہمارے ڈاکٹر ظہور الدین احمد کو آکر دیکھ لے!

نعیم صاحب دبلے پتلے آدمی تو تھے ہی بیماری اور بڑھاپے نے بھی کھال اور ہڈیوں کے سوا ان کے

پاس کچھ نہ چھوڑا تھا مگر اس کے باوجود بھی صدیقی صاحب کے چہرے سے وہی جلال و جمال عیاں تھا جو نصف صدی قبل میں نے سرگودہا میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ان کی آواز میں وہی زور تھا، نطق اور گویائی میں رتی بھر فرق نہیں تھا اس دن مجھے صرف اندازہ ہی نہیں یقین بھی ہوگیا کہ زمانے کے طوفان اور تھپیڑے بھی اللہ کے بندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے! ان کی باتوں سے مجھے یوں لگ رہا تھا کہ زمانے کی نصف صدی میرے سامنے ہے! مگر یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ملاقات آخری ہوگی اور رابطے کے ساتھ ان کی نشست ایک حسرت بن کر رہ جائے گی! یہ یقین اس وقت حاصل ہوا جب منصورہ کی مسجد کے سامنے والے لان میں سید منور حسن صاحب ان کے سوانح حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالنے لگے تھے اور مولانا عبدالرحمٰن اشرفی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی! حق تعالیٰ مغفرت کرے......!

* * *